ڈاکٹر تنویر احمد علوی

حکیم عبدالحمید (مرحوم)

حکیم عبدالحمید کو مرحوم کہنے کو جس سے ان کے سفرآخرت کی طرف اشارہ ہے جی نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ ایسی شخصیتیں تو روحانی طور پر زندہ رہتی ہیں۔ فارسی کا مشہور شعر اس موقع پر یاد آتا ہے:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامے ما

(ترجمہ: جس انسان کا دل عشق کی بدولت زندہ ہو گیا اب ہرگز اس کے لیے موت نہیں ہے۔ اس کا نام یا ذکر خیر تو جریدۂ عالم کے روشن صفحے پر برابر نورافشاں رہے گا اور اسے کوئی مٹا نہیں سکے گا۔)

عشق سے دل کا زندہ ہونا دراصل نیک کاموں کا ذہن اور زندگی پر وہ اثر ہے جو زمانے پر ہمیشہ کے لیے اپنے روشن وشفاف اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کو علم اور توفیقِ خدا کی دین ہوتی ہے مگر اس عملِ محبت کے لیے کچھ خاص دل ہی مخصوص ہوتے ہیں جو واقعتاً انسانیت کی وہ ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں جن میں دوسروں کی بھلائی کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور یہ انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ ایسے کچھ نیک کام اس کے ذریعے روبہ عمل آئیں وما توفیقی الا باللہ (اور نہیں ہے توفیق سوا اللہ کی دین کے) میں نے جب انسانوں کو اپنے حالات اور خیالات کے روشن دائرے میں رہتے ہوئے نیکیاں اور بھلائیاں کرتے ہوئے دیکھا تو اکثر قرآنِ پاک کی مقدس آیت اپنے معنی اور معنویت کے ساتھ نظر کے سامنے آ گئی۔

حکیم عبدالحمید بہت سے انسانوں کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے، سچائی ہے کہ جن لوگوں نے حکیم عبدالحمید کو بہت قریب سے نہیں دیکھا وہ بہت سے تعارف ناموں اور تعریفات کے ساتھ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حکیم عبدالحمید کیا تھے اور ان کی شخصیت کو ان کی انسانی خوبیوں کے ساتھ جانچنے اور پرکھنے کا پیمانہ کیا ہوسکتا ہے۔ فارسی کی شاعری میں بہت سے بیش بہا موتی ہیں، ان میں شخصیت وشعور کا ایک پیمانہ وہ بھی ہے جس کا اختتام اس جزوِ کلام پر ہوا ہے:

لیکن تو چیزے دیگری

حکیم صاحب کو اگر دیکھیے تو وہ بے حد سیدھے سادے، ملنسار، خوش اخلاق، سادہ کلام مگر معنی خیز شخصیت تھے۔ ان کی شرافتِ مزاج، خلوصِ خدمت اور جذبے کی پاکیزگی سے حکیم صاحب کو دیکھنے والا ہر آدمی پہلی نظر میں متاثر ہو جاتا تھا مگر ان کی شخصیت وشعور کی پرتیں دھیرے دھیرے کھلتی تھیں۔ ان کے عقل وشعور کی انسانی وسعتوں تک پہنچنا اور ان کی داخلی شخصیت کو پھولوں کی خوشبوؤں کی طرح محسوس کرنا شاید سب کے حصے میں نہیں آتا تھا۔ ان کے یہاں سادہ پن کا یہ عالم تھا کہ ان کو پہلی نظر میں کوئی آدمی یہ کہے کہ پوری طرح دیکھ بھی نہیں پاتا تھا ان کا معاملہ کچھ ایسا تھا جسے اس شعر میں کسی شخصیت کی پہلو داریوں کو پیش کیا گیا ہے:

از شمارِ نظر زیکتا / وز حساب خرد ہزاراں بیش

یعنی وہ ظاہری نظروں سے اگر دیکھا جائے تو ایک تن سے بھی کم تھے یعنی دبلے پتلے اور منحنی سے آدمی۔ چھوٹی موری کا علی گڑھ کٹ پائجامہ، اس پر سفید کپڑے کا قدرے نیچا سا کرتا اور کرتے یا قمیض پر شیروانی جس کا سفید رنگ بھی کبھی مشکل ہی سے بدلا ہوگا۔ راقم الحروف نے ہمیشہ انھیں ایک سادہ سی سفید شیروانی میں دیکھا۔ پیروں میں ضرور انگریزی وضع کا جوتا پہنتے تھے۔ تیز تیز چلتے تھے اور از راہِ شرافت نگاہیں نیچی کیے رہتے تھے۔ انھوں نے توجہ فرمانی کے طور پر بھی آنکھیں ملانے اور دوبدو انداز اختیار کرنے کی روش وکشش کو شاید ہی کبھی پسند کیا ہو۔ اس لیے کہ ان کے مزاج میں ایک طرح کی فطری نرمی اور شریفانہ آدھینگی تھی جس کی وجہ سے ان کی گردن میں شاید ہی کسی نے کبھی ایسا خم دیکھا ہو جس سے

شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک طرح سے شخصی بڑائی کا احساس موجود رہتا ہے۔

وہ کبھی اونچے لہجے میں بات کرتے ہوں ایسا کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے اور الفاظ کے انتخاب میں جو ان کے یہاں قدرتی اور فطری ہوتا تھا ایک خاص طرح کی شرافت موجود رہتی تھی۔ یعنی لب و لہجے کی سنجیدگی، جملے مختصر ہوتے تھے اور اکثر کسی طوالت کو گفتگو میں راہ دیے بغیر اختصار پر ختم ہو جاتے تھے۔ ان کی بات چیت میں کبھی تصنع اور تکلف کا شائبہ بھی شامل نظر نہیں آتا تھا۔ یوں بھی ایک حکیم کو نہ تنک مزاج ہونا چاہیے اور نہ تند و تیز لہجے میں کبھی گفتگو کرنی چاہیے۔ خاص طور پر اپنے مریضوں کے ساتھ۔ اور حکیم صاحب کی طرف تو ان کے مریض یہ سوچ کر ہی رخ کرتے تھے کہ اللہ پاک نے ان کے ہاتھ میں شفاء دی ہے اور جن پر وہ توجہ فرما ہو جاتے تھے وہ ان کی دوائی سے نہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دعا سے شفایاب اور صحت مند ہو جاتا تھا۔ خاندانی پیشہ میں بڑی برکت ہوتی ہے اور حکیم صاحب کے لیے تو پیشۂ طبابت نیکوکاری اور خدمت گزاری کا ایک وسیلہ، طریقہ، سلیقہ تھا۔ وہ اوقاتِ عبادت کی پابندی کی طرح اوقاتِ مطب کی بھی پابندی کرتے تھے۔ اور جب مریض پر ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب کا عالم چھایا ہوا نظر آتا تھا تو اسے ہمدردانہ، مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے تسلی اور تشفی بھی دیتے تھے۔

فنِ طب میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ طبیب نبض دیکھتا ہے اور نبض کی حرکت اور اس کی نرمی اور گرم روی سے خون کی حرکات اور طبیعت کے سکون و سلامتی یا بے سکونی اور اضطراب کی حالت کو جان سکتا ہے۔ نبض دیکھ کر مرض کی کیفیت کا اندازہ لگانا معمولی بات نہیں۔ اب تو خیر بہت سے آلات ایجاد ہو گئے جن کی مدد سے مریض کے طبعی کوائف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مگر ایک وقت بہت کچھ انحصار نبض کی رفتار پر ہی ہوتا تھا۔ حکیم صاحب جس توجہ سے نبض دیکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے ذہنی انہماک سے بھی ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ مریض کے چہرے پر نظر کیے رہتے تھے اور اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کی سعی مشکور فرماتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی خاندانی پیشہ ہونے کے علاوہ باقاعدہ فنِ طب کو پڑھا تھا۔ میرے والد بھی ایک جید طبیب اور حکیم حاذق تھے۔ میں نے تو ان کو نہیں دیکھا مگر وہ اپنے زمانے کے بہت ممتاز اور لائق اطبا میں گنے

جاتے تھے اور حکیم عبدالمجید خاں صاحب (حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی) کے شاگرد تھے۔ ان سے مطلق جو کچھ سنا اس نے بھی فن طب سے میری دلچسپی کو آگے بڑھا دیا۔ حکیم عبدالحمید کو میں اس پیشہ کا ماہر مان کر بھی ان سے ایک گونا شخصی واقفیت اور گہری عقیدت رکھتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ جب وہ مریض کو دیکھ رہے ہوں تو میری آنکھیں بھی اشتیاق واحترام سے ان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔

حکیم صاحب نے حکمت سے کیا کچھ کمایا یہ تو میرے علم میں نہیں مگر انھوں نے اس کے ذریعے کس قدر نیکیاں کمائیں اور خلق خدا کی خدمت کی یہ بات ہمیشہ میری نظر میں رہی کہ حکیم صاحب عظمتِ کار کے قائل تھے۔ اور وہ اپنی ذات کی حد تک کام میں لگے رہنے اور اس کے وسیلے سے عظمت حاصل کرنے کے قائل تھے۔ خدا نے انھیں ان کی اپنی فکر، ان کے اپنے منصوبہ بند ذہن اور متحرک شعور و شخصیت کے ذریعہ بہت کچھ دیا اور عظیم بنایا۔ اس کے باوجود انھیں اپنے دورِ عظمت و عروج میں بھی میں نے کو اپنی تجربہ گاہ میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حکیم صاحب کا مجھ پر یہ خاص کرم تھا کہ وہ مجھے ان لمحات میں بھی یاد فرما لیتے تھے جب کہ وہ اپنے خاص کمرے میں دوا سازی کے عمل میں مصروف ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ جب میں نے موصوف کو جواب مرحوم ہوگئے ہیں اس حالت میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ دواؤں میں بھرے سنے تھے تو میں نے کہا کہ حضرت آپ مجھے میری عقیدت کو جانتے ہوئے بھی کبھی ہاتھ چومنے کی اجازت نہیں دیتے مگر اس وقت تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چومے جائیں کہ وہ دوا میں ایک طرح سے سنے ہوئے ہیں۔ ہنس کے کہنے لگے کہ جب دوا تیار ہو جائے گی تو بہت لوگوں تک پہنچے گی اور جو لوگ اس دوا کو کھائیں گے وہ گویا ان ہاتھوں کو ضرور چومیں گے، جنھوں نے اسے تیار کیا ہوگا اور وہ میرے دواخانہ کے ساتھ ہی اور کام کرنے والے ہیں۔ دوائیں اپنی خوشبو، اپنے رنگ اور اپنی موجودگی سے بھی ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ یہ تاثر آپ کی زندگی پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ جو لوگ آپ سے براہِ راست واقف نہیں ہیں وہ اسے پورے طور پر اپنے تصور اور تاثر کا حصہ بھی نہیں بنا سکتے۔

حکیم صاحب نے اپنی شعوری کوشش، ذہنی کاوش اور دوراندیش ذہن کی مدد سے ہمدرد کے ایک چھوٹے سے دواساز ادارہ کو اتنا بڑا بنا دیا کہ اس کا کوئی اس دور میں خیال بھی نہیں کرسکتا تھا جب ہمدرد قائم کیا گیا تھا مگر حکیم صاحب کی کوشش و کاوش سے یہ خواب برابر اپنی تعبیروں کے سانچے میں ڈھلتا رہا۔ اس خواب کو حقیقت بنانے میں حکیم صاحب کے ساتھیوں کا بھی بہت بڑا Contribution ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے پردادا اکبرِ اعظم کے لیے یہ لکھا تھا کہ حضرت عرش آشیانی کیوں کہ بہت اچھے ملازم اور نوکر اپنے دربار میں رکھتے تھے۔ اسی لیے متواتر فتوحات اور مسلسل مہمات میں لگے رہتے تھے۔

حکیم صاحب کے پاس کوئی سلطنت تو نہ تھی مگر وہ اپنے ساتھیوں کے دلوں پر حکومت ضرور کرتے تھے اور اس کو سمجھنے کے لیے ہم اقبال کے اس مصرعہ سے مدد لے سکتے ہیں:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

حکیم صاحب نے محبت سے دلوں کو جیتا اور وہ اپنی کارپردازانہ فتوحات میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی شامل رکھتے تھے اور ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے۔

کسی طرح کا تفاخر اور تکبر حکیم صاحب کے ذہن و زندگی میں داخل ہی نہ تھا وہ ہنسی مذاق تو شاید نہ کرتے ہوں کہ مزاج میں ایک خاص طرح کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ بہت ہی لطیف سی ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔ بہت نرمی، سلامت روی اور اپنائیت کے شریفانہ لہجہ میں باتیں کرتے تھے۔ تیز تیز بولتے تھے اور ان کے جملے اکثر مختصر ہوتے تھے۔ اس پر بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی گفتگو میں ذرا بھی بے تعلقی کا اظہار کیا ہو۔

وہ علمی گفتگو اکثر کرتے تھے اور اس میں واقفیت کا اظہار تو موقع بہ موقع ہوتا رہتا تھا مگر کسی طرح کی دعویداری کبھی شامل نہیں ہوتی تھی۔ اکثر طبی تاریخ سے متعلق خیال انگیز گفتگو ہوتی رہتی تھی اور فنِ طب کو وسطی عہد میں آگے بڑھانے کا کام جن حکما اور اطبا نے اپنے اپنے وقت میں کیا تھا وہ اس سے واقف بھی تھے اور ان کے بارے میں کلماتِ تحسین و اعتراف ان کی زبان پر آتے رہتے تھے اور گفتگو کا انداز اس حد تک شریفانہ ہوتا تھا جیسے وہ اپنے مخاطب سے کچھ سیکھ رہے ہوں۔ سکھانے والا انداز وہ کبھی اختیار نہیں کرتے تھے۔

دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف اور اپنے چھوٹوں پر شفقت و مرحمت کی نظر برابر رہتی تھی۔ یہ بڑی بات تھی کہ حکیم صاحب کو کسی طرح کا کمپلیکس نہیں تھا۔ اسی لیے وہ بے تکلف بات بھی کچھ اس طرح کرتے تھے کہ جیسے اس پر دھیان رکھتے ہوں کہ جہاں بے تکلفی ہو وہاں تکلف انتہائی ضروری ہو جاتا ہے۔

حکیم صاحب نے بہت کام کیا اور بقول شخصے اس علم و عمل کے "پتلے" کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہیں تھا۔ اللہ پاک نے ان کو اپنی خصوصی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا تھا، جس کا سب سے خوش آئند اثر ان کے حسنِ سلوک اور جذبۂ خلوص و خدمت سے ظاہر ہوتا تھا۔

اس زمانہ کی بات الگ رہی جب وہ بیمار تھے یا کبھی بیمار رہے ہوں گے ورنہ ان کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا اور اس میں مریضوں کو دیکھنا، اپنے ادارے کے معاملات سے باخبر رہنا اور اس کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھنا یہ کہیے کہ ان کے معمولات کا حصہ تھا اور اسی میں وہ مجھ ایسے اپنے کسی نیازمند کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے اور اپنی شریفانہ گفتگو اور عملی نکتہ سنجیوں سے اس گفتگو کو روشن اور شفاف بناتے تھے۔

ان کا بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے ایک ناسازگار ماحول میں فنِ طب کی بقا اور فن دواسازی کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھا۔ ہماری توجہ اس طرف بہت کم جاتی ہے اور اس کی وجہ معلومات کی کمی نہیں طریقۂ رسائی کی کوتاہی ہے کہ فنِ طب کا تعلق ہماری تہذیب اور تاریخ سے بہت گہرا ہے اور مختلف اعتبارات سے وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ہمارے فنِ تعمیر، فنِ مصوری اور فنِ موسیقی کو فنِ طب سے جو قوسِ قزح جو رنگا رنگ رشتہ ہے ہم نے بہت کم اسے فنِ طب کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یہاں سقف و ستون، منبر و محراب اور دریچہ و دروازہ فنِ طب سے ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس میں خشت و سنگ کا استعمال، منبر و محراب اور دریچہ و در جن نسبتوں کے ساتھ بنائے جاتے ہیں، اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو ان کا صحت اور حفظانِ صحت سے ایک ناقابلِ شکست رشتہ ملے گا۔

فنِ مصوری کا فنِ طب سے جو گہرا تعلق رہا ہے ہم نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا۔ اسپین، مرکزی ایشیا، عراق، یمن اور ہندوستان میں فنِ طب کے ایسے مخطوطے ملتے ہیں، ان میں امراض کی کیفیت اور مریض پر اس کی نفسیات کو جن تصویروں اور مرقعوں کے

سانچے میں ڈھالا گیا ہے اس سے پتہ چلا کہ فنِ مصوری کو فنِ طب کی فکری اور فنی رسائیوں نے کہاں تک متاثر کیا۔

راقم الحروف کو ایسے مخطوطوں سے گزرنے کا موقع ملا ہے، جن میں تصویروں کے رنگ، ان کے خاکوں اور تاثراتی مرقعوں کو تحریر کے ساتھ تصویر کے فن سے بھی گہری مناسبت رہی ہے۔ تاثرات ان تصویروں میں بطورِ خاص دیکھنے کے لائق ہیں جہاں مرض، علاج اور عملِ جراحی کے اثرات کو چہرے، پیشانی اور آنکھوں پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فنِ طب کے مخطوطوں میں ایسے مخطوطے بھی ملتے ہیں کہ جہاں دواؤں کی مدد سے پانی کی تاثیر بدل گئی اور اس کے وسیلے سے پھر پتھروں میں نازک نقاشی ممکن ہوئی۔ راگ راگنیوں کا انسانی نفوس، ارواح اور قلوب پر جو اثرات ہوتے ہیں ان کو بھی فنِ طب میں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ علم قرائن، قیاس اور قیافے سے بھی فنِ طب میں بہت غیر معمولی مدد لی گئی ہے۔ اس نوعیت کے لطائف، قصہ اور حکایات بھی فنِ طب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں ملتے ہیں۔

حکیم صاحب سے اکثر ان امور پر تبادلۂ خیال بھی ہوا اور حکیم صاحب نے اپنے اس گوشۂ فکر کو بھی سامنے آنے کا موقع دیا کہ فنِ طب کی کوئی تہذیبی تاریخ بھی مرتب ہونی چاہیے۔ اب معلوم نہیں وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنا سکے۔ جب کہ مرحوم کے یہاں خیال و عمل کی پرچھائیاں ایک ساتھ حرکت کرتی تھیں۔ فنِ طب کی تاریخ اور اس کے تہذیبی رشتے کس طرح مرحوم کی نظر میں رہے، اس کا اندازہ ہمدرد نرسنگ ہوم، آصف علی روڈ کے گیسٹ ہاؤس کی ایک سے زیادہ تصویروں سے ہوتا ہے جن میں شیخ و رئیس بوعلی سینا اور دوسرے نابغوں کی جاذبِ توجہ اور فکر انگیز تصویریں موجود ہیں۔ کاش حکیم صاحب اپنے اس خیال کو بھی عملی جامہ پہنا سکتے کہ فنِ طب کی تہذیبی تاریخ اس طرح مرتب ہوتی کہ اس میں ہماری ثقافتی تاریخ کے ارتقائی گوشے سامنے آجاتے۔ ہمدرد نگر تغلق آباد حکیم صاحب کی آخری آرام گاہ بھی ہے لیکن وہ ان کے خواب اور خوابوں کی تعبیرات کے ایسے مرقعوں کا تصویر کدہ بھی ہے جہاں ہم حکیم صاحب کے ذہن، زندگی اور زمانے کو بیک وقت منجمد اور متحرک دیکھ سکتے ہیں۔

حکیم صاحب، خدا ان کی روح پر فتوح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی خاک کو عنبرین فرمائے۔ مرحوم بے حد خوش قسمت اور خوش کردار انسان تھے۔ انھوں نے اپنے ادارے کو جس کے وہ سربراہ تھے بہت سے اداروں میں بدل دیا اور اس کی بہت سی شاخیں ملک بھر میں پھیل گئیں۔ یہ صرف ایک ادارۂ تجارت کی ہی کامیابی اور ترقی نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک تاریخ اور ایک روایت کی نئی زندگی کی روشن علامت بھی ہے۔ فن طب کو زندہ رکھنا ایک فلسفۂ علم و عمل کو نئی زندگی بخشنے کی کوشش کرنا بھی ہے۔

حکیم صاحب نے ہمدرد صحت کے ذریعہ ایک طویل زمانے تک فن طب کو نیز اس کی جہت نمائیوں کو آج کے دور میں روشناس کرنے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے لیے قوم اور ملک سے جو کچھ لیا اس سے کہیں زیادہ اپنے اداروں کی شکل میں اسے اپنے علم و عمل اور فکر و فن کی نئی ترقیوں اور ترقی کی نئی جہتوں کی شکل میں واپس دیا بھی۔

خوش قسمت وہ ہی نہیں ہوتا جسے خاندان یا دوسرے اشخاص کے ذریعہ بہت کچھ مل جائے بلکہ وہ شخص ہوتا ہے جو دوسروں کو بہت کچھ دے جائے۔

□□